ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

مارچ ۲۰۱۹

www.inzaar.pk

March 2019

اپنے حریف کی پست سطح پر اتر کے اسے جواب دینا
چاہے آپ کی فتح نظر آئے مگر یہ در حقیقت آپ کی شکست ہے

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ابو یحییٰ کی نئی کتاب

بندگی کے سو رنگ

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''میں نے جن وانس کو اپنی بندگی ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''، (الذاریات 51:56)

بندگی کی یہ دعوت اپنے اندر اتنے ہی رنگ لیے ہوئے ہے جتنے خود زندگی کے مختلف رنگ، پہلو اور گوشے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں زندگی کے ان رنگوں کو بندگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس مجموعہ مضامین کا نام ''بندگی کے سو رنگ'' رکھا گیا ہے۔

کتاب کا ہر مضمون وہ زاویہ نظر دیتا ہے جو ایک بندہ مومن سے اس کے مالک کو مطلوب ہے۔ چاہے اس کا تعلق زندگی کے فکری پہلو سے ہو یا عملی پہلو سے۔ بندگی کی سوچ مومن کی فکر و عمل کے ہر رنگ کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ بندے کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر رنگ کو مالک کے بنائے ہوئے کینوس (canvas) کے پس منظر میں دیکھے۔

اس طالب علم کو یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد آپ کی زندگی بندگی کے رنگوں میں انشاءاللہ رنگ جائے گی۔ یہی اس کتاب کا مقصد تصنیف ہے۔

ابو یحییٰ

ماہنامہ
اِنذار

مارچ 2019ء جمادی الثانی/رجب 1440ھ

جلد 7 شمارہ 3

ابو یحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ ــــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

How can I help?

اس دنیا میں باقی مخلوق کے مقابلے میں انسانوں کی کامیابی کا راز اجتماعیت ہے۔انسان مل کر رہتے اور مل کر کام کرتے ہیں۔ یوں ان کی صلاحیت، طاقت اور استعداد اُس زمانے میں بھی بہت زیادہ تھی جب انسان پتھر کے دور میں باقی مخلوقات کے مقابلے میں بہت کمزور تھا۔

انسانوں کی اجتماعیت کو موثر بنانے کی، تاہم، ایک بنیادی شرط ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہر شخص دوسرے کی مدد کے لیے تیار ہو۔اس کے برعکس جہاں لوگ کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے رہیں یا باتیں بناتے رہیں یا اعتراض برائے اعتراض کرتے رہیں۔ وہاں نہ کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے نہ کوئی کامیابی ملا کرتی ہے۔ کامیابی صرف How Can I help? کلچر سے ملتی ہے۔

جس معاشرے میں لوگ محض تماشائی بننا پسند کریں یا اعتراض کرنے ہی کو اصل کام سمجھیں، وہاں کوئی خیر جنم نہیں لیتا۔ وہاں ہر شخص پتھر کی طرح بے حس ہوتا ہے یا منفی سوچ کا حامل بن کر زندگی گزارتا ہے۔وہاں ہر اجتماعیت ناکام ہوتی ہے اور ہر ادارہ برباد ہو جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ بدقسمتی سے اس وقت ایسا ہی ایک معاشرہ بن چکا ہے۔ یہاں اجتماعیت انسانوں کی ایک بھیڑ کا نام ہے اور بس۔ یہاں بیشتر لوگ دوسروں کے مسائل سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ وہ صرف اپنے لیے جیتے ہیں اور اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ اجتماعی معاملات میں اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے ان کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ کچھ باتیں بنالیں۔ جذباتی تقریریں کردیں۔ دوسروں کی کمزوریاں نکالیں اور ان پر اعتراض کریں۔ پاکستان کے چھوٹے بڑے تمام اداروں سے لے کر عام خاندانوں تک یہ مرض عام ہو چکا ہے۔

تاہم یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کی دنیا میں صرف How can I help Culture ہی اجتماعی خیر کی ضمانت ہے۔ باقی ہر رویہ وہ تباہی لاتا ہے جس میں آخر کار سب کا نقصان ہوتا ہے۔

سویلین بالادستی اور قانون کی بالادستی

پچھلے کچھ برسوں سے پاکستان میں سویلین بالادستی کا بہت شور ہے۔ اسے تمام سیاسی اور اسی کے ذیل میں دیگر مسائل کے حل کا بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ سویلین بالادستی پاکستان کے کسی مسئلے کا حل ہوتی تو پاکستان کے مسائل 1971 سے 1977 کے درمیان میں حل ہو چکے ہوتے جب سویلین بالادستی آخری درجہ میں قائم تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا اصل مسئلہ قانون کی بالادستی کا نہ ہونا ہے۔ جس روز یہ مسئلہ حل ہو گیا سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

قانون کی بالادستی کیا ہے؟ یہ اس حقیقت کو ماننے کا نام ہے کہ کوئی سویلین ہو یا غیر سویلین، جرنل ہو یا جج ہو، طاقتور ہو یا کمزور ہو سب پر قانون کے مطابق چلنا فرض ہے۔ جو شخص اس اصول کی خلاف ورزی کرے گا، وہ ہر عوامی اور سرکاری عہدے کے لیے نااہل ہو جائے گا۔

مگر ہمارے ملک کی حقیقت یہ ہے کہ یہاں ہر طاقتور انسان چاہے وہ کسی بھی عہدے پر ہو، اپنے مفاد کے لیے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس ملک کے جج اور وکیل بھی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس پارلیمنٹ، جو قانون کا سرچشمہ ہے، کے اراکین ہی قانون کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔ جہاں قانون کے رکھوالوں کی صورتحال یہ ہو وہاں کسی اور سے قانون کی پاسداری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سویلین بالادستی بھی قانون کی بالادستی ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیونکہ قانون یہی کہتا ہے کہ معاشرے میں سویلین کی بالادستی قائم ہونی چاہیے۔ مگر خود سویلین کو مادر پدر آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ طاقت ملنے پر یہ خود بھی فرعون سے کم ثابت نہیں ہوتے۔ اس لیے جو عوام کا بھلا چاہتے ہیں انھیں قانون کی بالادستی کی بات کرنی چاہیے۔ ورنہ سویلین بالادستی قائم ہو بھی گئی تو فسطائیت اور ظلم کی ایک نئی شکل کے سوا ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔

مولانا آزاد، ہدف اور اخلاص

بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر میں جن اہل علم نے لوگوں میں قرآن مجید کا ذوق پیدا کیا ان میں ابوالکلام آزاد کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی تفسیر ترجمان القرآن گرچہ ان کی سیاسی مشغولیات کی بنا پر مکمل نہ ہوسکی، مگر اپنے بعض مباحث کی بنا پر بڑی مقبول ہوئی۔ اس تفسیر کے انتساب میں مولانا نے ایک بڑا دلپذیر واقعہ لکھا ہے۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ میں 1918ء میں رانچی (مشرقی ہندوستان میں ریاست جھاڑکھنڈ کا ایک شہر) میں نظر بند تھا۔ ایک روز ایک بہت غریب شخص آیا جو غربت کی بنا پر قندھار سے کوئٹہ اور آگرہ سے رانچی تک پیدل چلتا رہا تھا۔ جبکہ کوئٹہ سے آگرہ تک کسی کی نوکری کرتا ہوا پہنچا تھا۔ یہ کل دو ہزار کلومیٹر سے زیادہ کا ایک انتہائی تکلیف دہ سفر تھا۔ مولانا نے اس تکلیف دہ سفر کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس نے ان کے رسالوں ''الہلال'' اور'' البلاغ'' کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے اور وہ ان سے قرآن کے کچھ مقامات سمجھنے آیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ وہ شخص ایک روز بغیر بتائے ان کے پاس سے چلا گیا۔ وہ جاتے وقت ان سے اس لیے نہیں ملا کہ مولانا اسے واپسی کے مصارف کے لیے پیسے نہ دے دیں۔ مولانا نے اس کے اخلاص، قربانی اور جذبے کی بنا پر اس تفسیر کا انتساب اسی کے نام کر دیا۔

مولانا آزاد بلاشبہ اپنے زمانے کے بڑے لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ احیائے اسلام کی فکر کا خواب دکھانے کے علاوہ عوام الناس میں فہم قرآن کی روح پھونکنے والے بھی پہلے آدمی تھے۔ اس واقعے کے ایک صدی بعد احیائے اسلام کے لیے کام کرنے والی جماعتوں اور لوگوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو چکا ہے اور فہم قرآن کے لیے لوگوں کا ذوق وشوق عروج پر ہے۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ لوگ آج بھی اتنے ہی اخلاص سے دین کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں جتنے اخلاص سے وہ

افغانی دو ہزار کلومیٹر کا سفر پیدل چل کر اور نوکری کی مشقت کرتا آزاد کے پاس آیا تھا۔

مگر عجیب بات ہے کہ آج تک نہ احیائے اسلام کی فکر کے تحت دیکھا جانے والا غلبہ اسلام کا خواب اپنی تعبیر پا سکا نہ قرآن مجید کے فہم کے نتیجے میں وہ سیرتیں نمودار ہوئیں جو صحابہ کرام کی سیرتوں کا کسی درجہ میں بھی عکس ہوتیں۔ ہاں ہماری قوم نے مذہب کے نام پر دہشت گردی، فرقہ وارانہ قتل و غارتگری، تکفیر اور انتہا پسندی کی تمام شکلیں دیکھ لیں۔ ہم معاشی ترقی اور عزت و تکریم میں دنیا میں سب سے پیچھے ہیں۔ ہاں پورنوگرافی دیکھنے، کرپشن، ملاوٹ، بدعہدی جیسے پست اخلاقی رویوں میں سب سے آگے ہیں۔

اس کی سادہ وجہ یہ ہے کہ خدا کی دنیا میں کسی منزل پر پہنچنے کے لیے اخلاص اور قربانیوں کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ اصل حیثیت اس بات کی ہوتی ہے کہ آپ کا راستہ درست ہو۔ جبکہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ خدا کی دنیا میں غلبہ ان اقوام کو ملتا ہے جو علم اور اخلاق میں آگے ہوں۔ ابن خلدون سے لے کر آج تک کے سارے سوشل سائنٹسٹ کی یہی رائے ہے۔ باقی رہا قرآن تو اس کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ وہ جس چیز کو بطور ہدف کے پیش کرتا ہے وہ اپنے نفس کو پاکیزہ بنا لینے کا عمل ہے اور جنت اسی کا بدلہ ہے، (الاعلیٰ 14:87، طٰہٰ 76:20)۔

اس کے بجائے اگر ہدف خارج کی کسی تبدیلی کو بنایا جائے گا تو پھر ساری توانائی خارج کو بدلنے پر لگے گی اور انسان خود ایمان و اخلاق کی ہر آلودگی سے بے پروا رہے گا۔ ایسے لوگوں کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آئے گا مگر دوسروں کی آنکھ کا تنکا فوراً نظر آ جائے گا۔ وہ ایسے بوجھ، جو لوگوں کی کمر توڑ ڈالیں، ان کی پیٹھوں پر رکھیں گے اور خود ان کو انگلی بھی نہیں لگائیں گے۔ وہ مچھروں کو چھانیں گے اور اونٹوں کو نگل جائیں گے۔ جب تک ہم قرآن کی اصل تعلیم یعنی ایمان و اخلاق پر نہیں لوٹیں گے، ایسے ہی دیندار ہمارا مقدر رہیں گے اور دنیا کی رسوائی ہمارا انجام رہے گی۔

آنے والا دور

پچھلے برس اس طالب علم نے ایج آف آٹومیشن (Age of Automation) کے حوالے سے ایک مضمون لکھا اور پھر ملک کے متعدد شہروں میں اس حوالے سے لیکچرز بھی دیے تھے۔ ان کا مقصد لوگوں کو آنے والے اُس دور پر متنبہ کرنا تھا جو غالباً قیامت سے قبل انسانیت کا آخری دور ہوگا۔ پیش نظر یہ یاد دہانی کرانا تھا کہ ایمان و اخلاق کی قرآنی دعوت کی اہمیت کو لوگوں پر واضح کیا جائے اور لوگوں کو متوجہ کیا جائے کہ اپنی ذہانتیں اور صلاحیتیں غیر ضروری میدانوں سے ہٹا کر قرآن مجید اور علم و عقل کی بنیاد پر ایمان کی پختگی کے اُس میدان میں لگائی جائیں جو ہمارا آخری دفاعی مورچہ ہوگا۔

اس ضمن میں ایک چیز یہ بیان کی گئی تھی کہ روبوٹکس، مصنوعی ذہانت (AI)، جینیٹکس اور تھری ڈی پرنٹنگ وغیرہ میں جو ترقی ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے اس کے نتیجے میں اب وہ مصنوعی روبوٹ تیار ہو چکے ہیں جو مردوں کو عورتوں کی ضرورت سے بے نیاز کر دیں گے۔ اس وقت تو یہ روبوٹ (Sexbots) خوبصورت لڑکیوں کی شکل میں بنائے گئے ہیں تاکہ مردوں کی جبلی ضروریات کی تسکین کر سکیں، لیکن آنے والے دنوں میں جیسے جیسے ٹیکنالوجی ترقی کرے گی، یہ بتدریج مکمل بیوی اور شوہر کی جگہ لے لیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پوری طرح باشعور ہوں گے۔ مختلف مزاج کے حامل ہوں گے جو مختلف مواقع پر مختلف رویوں کا مظاہرہ کرنے پر قادر ہوں گے۔ انسانی شخصیت کے سارے رنگ اپنے اندر سمیٹے یہ روبوٹ صرف اولاد پیدا کرنے کے معاملے میں محروم ہوں گے۔ اس کے لیے عورتیں، مرد روبوٹ کی یہ کمی سپرم بینک سے اور مرد، عورت روبوٹ کی یہ کمی (Surrogate Mothers) سے پوری کر کے اولاد بھی حاصل کر سکیں گے۔

اس طرح اہل مغرب کی سوچ یہ ہے کہ مزاج کے اختلافات کی بنا پر خاندان کے ٹوٹنے، خاندانی تشدد، میاں بیوی کی بے وفائی جیسے مسائل سے نجات حاصل کرنا ممکن ہوجائے گا۔مزید یہ کہ بچوں کی بہتر نگہداشت، تربیت اور تحفظ کا بھی بندوبست ہوسکے گا۔کیونکہ ایسے روبوٹ بہترین معلم، محافظ اور ماں باپ جیسی شفقت بغیر کسی مشکل کے چوبیس گھنٹے فراہم کرنے کے قابل ہوں گے۔

اس تصور پر مغرب میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور متعدد فلمیں بن چکی ہیں۔ سائنسدانوں کو امید ہے کہ اس صدی کے آخر تک وہ اس طرح کے باشعور روبوٹ بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔جس کے بعد ہر جگہ ایسے نیم مشینی خاندان نظر آرہے ہوں گے۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ آنے والا دور کس طرح کے چیلنجز اور سوالات لے کر آرہا ہے۔انسانوں کی یہ طاقت ایک طرف ان میں بڑی غفلت اور گھمنڈ پیدا کرے گی دوسری طرف اسلامی شریعت جس کا ایک بڑا حصہ خاندان کے معاملات پر مشتمل ہے، اس کے بارے میں متعدد نئے اور الجھے ہوئے سوالات پیدا ہوجائیں گے۔

ایسے میں مسلمانوں کی فکری قیادت پر فرض ہے کہ وہ دین کی سیاسی اور فقہی تعبیرات، ظاہر پرستانہ دینداری، فروعی اور جزوی مسائل سے اوپر اٹھ کر قرآن مجید کی بنیاد پر اپنے مذہب کو پیش کرے۔کیونکہ قرآن مجید ہی ہر دور کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس سے کہیں زیادہ اہم قرآن مجید کی بنیاد پر لوگوں کی تربیت کرنے کا عمل ہے۔قرآن مجید اصلاً ایمانیات کی کتاب ہے۔اور آنے والے دور میں سب سے بڑا چیلنج ایمانیات کے حوالے ہی سے درپیش ہونے والا ہے۔اِس دور کے فتنے سے ہر نبی نے پناہ مانگی ہے۔امت حبیب کے آخری حصہ کو اسی دور کا سامنا کرنا ہے۔تیاری کر لیجیے۔یہ دور سر پہ آچکا ہے۔

نجات دہندہ اور انقلابی سوچ

پاکستان کے موجودہ ملکی اور خاص کر معاشی حالات ہر درد مند شخص کے لیے باعث تشویش ہیں۔ان کی اس قدر تفصیلات اِس وقت پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر آ رہی ہیں کہ ان کا دہرانا کارِ عبث ہے۔جس شخص کو اخبارات پڑھنے کا وقت میسر نہیں وہ اپنے بجلی ،گیس اور ضروریات زندگی کے بلوں اور مہنگائی کی بڑھتی ہوئی لہر کی شکل میں بھی اسے پڑھ سکتا ہے۔

موجودہ حکمرانوں کے تمام مخالفین اور اب تو ان کے حامی بھی اس صورتحال کی ذمہ داری عمران خان اور ان کی پارٹی پر ڈال رہے ہیں۔تاہم جس قدر مشکلات ہم اس وقت جھیل رہے ہیں اور آئندہ آنے والے دنوں میں مزید جھیلیں گے ،اس کی براہ راست ذمہ داری موجودہ حکمرانوں پر عائد نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سوچ کے علمبرداروں پر عائد ہوتی ہے جو عرصے سے قوم کو یہ جھوٹی امیدیں دلاتے رہے ہیں کہ بس ایک مخلص نجات دہندہ آئے گا اور ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ایک سیاسی انقلاب آئے گا اور ملک کی تقدیر بدل جائے گی۔

اب سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ ایک ایماندار اور مخلص نجات دہندہ اقتدار پر فائز ہے۔ انقلاب آیا ہے اور ایسا آیا ہے کہ سارے سیاسی مخالفین کو اپنی اپنی پڑی ہے۔مقتدر طبقات اور اہم ادارے سب حکومت وقت کے ساتھ ہیں یا کم از کم کوئی مسئلہ پیدا نہیں کر رہے۔ کسی سیاسی حکمران کو کام کرنے کا شاید ہی ایسا سازگار ماحول کبھی میسر آیا ہوگا۔مگر دیکھیے کہ ہم دنیا میں بھکاریوں کی طرح بھیک مانگتے پھر رہے ہیں اور پھر بھی مہنگائی کی لہریں غریبوں کی نیا ڈبونے کے درپے ہیں۔اتنے وسائل کی حامل کسی قوم نے شاید ہی ایسی ذلت کبھی دیکھی ہو۔

یہ صورتحال یہ حقیقت بالکل کھول کر رکھ دیتی ہے کہ موجودہ دنیا اتنی زیادہ پیچیدہ ہے کہ یہ نہ تنہا کسی نجات دہندہ کے بس کی بات ہے اور نہ کوئی انقلابی تبدیلی یہاں کوئی خیر لا سکتی ہے۔دوسو

برس پہلے مغرب نے اور اِس دور میں چین نے دنیا کو یہ سبق دیا ہے کہ تدریجی تبدیلی اور اداروں کی بہتری ہی مستحکم اور دیرپا تبدیلی لاتی ہے۔کاش ہماری قوم کواب یہ بات سمجھ آجائے۔

اب ہم کیا یاد دلائیں کہ 2013ء کے الیکشن کے بعد سے ہم بار بار کس چیز کی طرف موجودہ حکمرانوں کوتوجہ دلاتے رہے تھے۔وہ اگر ان معقول باتوں کو مانتے تو آج نتیجہ کیا ہوتا۔وہ سوشل میڈیا کی پروپیگنڈا مہم پر بھروسا کرنے کے بجائے کے پی کے کو دنیا کا نہ سہی ایشیا کا اور ایشیا کا نہ سہی تو پاکستان ہی کا بہترین ترقی یافتہ صوبہ بنا کر پورے پاکستان کی آنکھیں کھول سکتے تھے۔

جس دھاندلی کے لیے تین سال کنٹینر پر چڑھے رہے، اس کی جگہ اسمبلی میں زور لگا کر شفاف الیکشن کے لیے کہیں بہتر قانون سازی پر اُس وقت کے حکمرانوں کو مجبور کر سکتے تھے۔دوسال تک جس پانامہ کے پیچھے ملک کو مکمل انتشار میں رکھا اور آج کے دن تک ایک پیسہ ملک کو واپس نہیں ملا، اس کی جگہ حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر جاری کرپشن کو روکنے کے لیے ان گنت اقدامات کروا سکتے تھے۔

اس سب کے نتیجے میں 2018ء کے الیکشن میں لازماً پی ٹی آئی کو جیتنا تھا کیوں کہ عمران خان کے پاس حقیقتاً عوامی حمایت موجود تھی۔پھر 2018ء یوں شروع ہوتا کہ پی ٹی آئی کے پاس مکمل تربیت یافتہ ٹیم ہوتی جو پچھلے پانچ برسوں میں کے پی کے کے تجربات کی روشنی اور سیاسی ہنگامہ آرائی سے دور رہ کر مکمل تیاری کے ساتھ اقتدار میں آتی۔کوئی عمران خان کو کٹھ پتلی حکمران کہنے کی ہمت نہیں کرتا۔فوج اور عدلیہ کی اخلاقی حیثیت پر سوال نہ اٹھتے۔پی ٹی آئی کو اتنی بری حالت میں ملکی معیشت نہیں ملتی اور سب سے بڑھ کر بدتمیزی پر مبنی موجودہ سیاسی کلچر نہیں پیدا ہوتا۔

ہم سب کچھ کہتے رہے اور سمجھاتے رہے مگر کسی نے کان نہ دھرے۔کیوں؟ اس لیے کہ یہاں عرصے سے ایک ہی پٹی قوم کو پڑھائی جارہی ہے کہ بس ساری خرابی ایک حکمران میں ہوتی

ہے اور حکمران بدلنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔نجات دہندہ کسی انقلاب کے ذریعے سے اقتدار میں پہنچ جائے اس کے بعد وہ جادو کی چھڑی گھمائے گا اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔اوپر بیٹھے ہوئے شخص کو بس ٹھیک ہونا چاہیے باقی سب خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ ہونا ہوتا تو حضرت عثمان اور حضرت علی جیسے جلیل القدر صحابہ جن کے کردار کی گواہی خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، ان کے دور میں فساد نہیں ہوتا۔حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے مجددِ امت کو زہر دے کر اقتدار سے نہیں ہٹایا جاتا۔

تاہم ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ابھی بھی سب کچھ ٹھیک ہوسکتا ہے۔مگر اس کے لیے پہلے یہ حقیقت سمجھنی پڑے گی کہ انقلابی تبدیلی کے بجائے تدریجی تبدیلی اجتماعی ترقی کا درست راستہ ہے۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا واحد نجات دہندہ چودہ سو برس پہلے ہی آ چکا ہے۔ہمیں کسی نجات دہندہ کا انتظار کرنے کے بجائے ان کی تعلیمات کو اختیار کرنا چاہیے۔ یہ تعلیم اخلاق، دیانت، حیا، صبر، درگزر اور عدل واحسان کی تعلیم ہے۔ان کا طریقہ تدریج کا طریقہ ہے۔ان کے پیدا کردہ اور ہمارے آئیڈیل لوگ جن کا نقشہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں کھینچا اور قرآن کی سورہ فتح میں اللہ نے دہرادیا وہ ایک درخت کے تدریجی ارتقا کی تمثیل ہے۔یہی ایمان، اخلاق کی روش اور تدریج کا طریقہ ہمارے لیے ترقی کا رول ماڈل ہے۔

باقی رہے ملکی حالات تو ہم وہی کاٹیں گے جو بویا ہے۔ وہی پائیں گے جو مانگا ہے۔ پیٹنا ہے تو پی ٹی آئی کے بجائے اب اپنا سر پیٹیں اور کوسنا ہے تو عمران خان کے بجائے ان فکری لیڈروں کو کوسیں جن کی انقلابی باتوں اور ایک نجات دہندہ کی بشارتوں کو مان کر ہم اس حال کو پہنچے ہیں۔خدا کی دنیا کسی خواہش پر تبدیل نہیں ہوتی۔اب حکومت وقت کو صبر کے ساتھ موقع دیں۔ اگر ہم نے صبر سے کام لیا تو بتدریج معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔

یہ ظلم کیسے ختم ہوگا؟

ساہیوال کے قریب سی ٹی ڈی کی فائرنگ سے مرنے والے خلیل احمد، ان کی بیوی نبیلہ، بیٹی اریبہ اور ہمسایہ کار ڈرائیور ذیشان کی موت پر پورے ملک میں ایک ہیجانی کیفیت طاری ہے۔مگر اطمینان رکھیے! پچھلے تمام ہیجانوں کی طرح یہ بھی دو چار دن کی بات ہے۔کوئی نیا مسئلہ آئے گا اور پھر سارا سوشل اور الیکٹرونک میڈیا اس کے پیچھے لگ جائے گا۔باقی رہا مظلوم خاندان تو اب اس کے ساتھ قیامت کے دن ہی انصاف ہوگا۔ہماری چیخ وپکار کسی کو انصاف نہیں دلا سکتی۔

مگر کیا قیامت سے قبل ظلم کی یہ سیاہ رات ختم ہوسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب ہاں میں ہے، مگر اس کی دو بنیادی شرائط ہیں۔ایک یہ کہ ہم اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھیں اور دوسرے یہ کہ اپنے جذباتی اندازِ فکر سے اوپر اٹھیں۔تعصّبات سے اوپر اٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ظلم پر صرف اس لیے آواز اٹھائیں کہ وہ ظلم ہے نہ کہ اس لیے کہ ہمیں کسی سے حساب چکانا ہے۔مگر ہمارا معاملہ کیا ہے؟ یہ کہ ہم میں سے کچھ مذہبی تعصّبات کے تحت دہشت گردوں کے حمایتی ہیں۔ دہشت گردوں نے اس ملک میں خون کی ندیاں بہا دیں اور ہم ان کے ہر ظلم کے باوجود اگر مگر کی تاویل سے انھیں بچاتے رہے۔

ہم میں سے کچھ سیاسی تعصّبات کے اسیر ہیں۔ہماری پسند کی سیاسی جماعت کے دور میں بھی یہ ظلم ہوتا تھا مگر ہم ظلم کے باوجود اس کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ہم میں سے کچھ قوم پرست ہیں۔قوم پرستوں کے ہر ظلم پر ہم اپنی زبان سی لیتے ہیں، مگر ایسا کوئی موقع مل جائے تو پھر ہم سب کی رگِ عدل پھڑک اٹھتی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ حساب چکانے کا وقت آ گیا۔دہشت گردوں کے حمایتی کاؤنٹر ٹیررازم ڈیپارٹمنٹ کی دھجیاں بکھیرنے پر اتر آتے ہیں۔سیاسی مخالفین نئی حکومت کو ٹف ٹائم دینے کی کوشش کرتے ہیں۔قوم پرست اسٹیبلشمنٹ کو ہدف بنا لیتے ہیں۔

یہ سب کر کے ہم انسانوں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ مگر عالم کا پروردگار جانتا ہے کہ یہ سب کے سب مجرم ہیں۔ یہ اپنے اپنے ظالموں کے حمایتی ہیں۔ اس لیے ہماری سزا ختم نہیں ہوتی۔ جب تک ہم صدق دل سے توبہ کر کے اور اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھ کر عدل و انصاف کو اپنی بنیادی قدر نہیں بنائیں گے، ظلم کی یہ رات ختم نہیں ہوگی۔

دوسری چیز جذبات سے اوپر اٹھنا ہے۔ ہمارے معاشرے میں آئے دن ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ اس سے کم یا زیادہ یا ملتے جلتے معاملات روز اخبارات میں آتے ہیں جن میں معصوموں کی جان، مال، آبرو برباد ہوتی ہے۔ مگر ہم وقتی طور پر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ پھر رات گئی بات گئی۔ قوموں کے مسائل ایسے حل نہیں ہوتے۔ قوموں کے مسائل حل کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو پوری زندگی لگانی پڑتی ہے۔ اور باقی لوگوں کو ان کی مدد کرنی ہوتی ہے۔

کچھ لوگ یہ طے کر لیں کہ وہ غربت کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ کچھ جہالت کے خلاف لڑنے کو زندگی بنا لیں۔ کچھ قانون کی درستی اور عدالتی نظام کی اصلاح کو اپنا ہدف بنا لیں۔ کچھ لوگ مذہبی انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے خود کو وقف کر دیں۔ کچھ لوگ ملاوٹ اور کرپشن کے خلاف نچلی سطح پر جنگ کے لیے زندگی لگا دیں۔ باقی لوگ ان کی مدد کریں اور ان کو سہارا دیں۔

جب کچھ لوگ ایسے کاموں کے لیے زندگیاں لگائیں گے تو پھر حقیقی تبدیلی آنا شروع ہوگی۔ پھر ظلم ختم ہونا شروع ہوگا۔ پھر بے گناہوں کو کوئی سرِ راہ اس طرح نہیں مارے گا۔ معصوموں کے سامنے ان کے ماں باپ نہیں قتل کیے جائیں گے۔ پھر پولیس مقابلے کے بجائے عدالتیں دہشت گردوں کو پھانسی دیں گی۔ پھر معاشرے سے ظلم اور فساد ختم ہوگا۔

اس کے بغیر ہم ایک کے بعد دوسرے سانحے اور ایک کے بعد دوسرے ظلم کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ یہی تاریخ کا سبق ہے۔ یہی خدا کا فیصلہ ہے۔

ابو یحییٰ

پورنوگرافی کا مسئلہ

دور جدید انسانی تاریخ کا ایک انتہائی مختلف اور منفرد دور ہے۔ اس دور میں جو مسائل جنم لے رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں اور ان کو روایتی طریقوں سے حل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان مسائل میں ایک اہم اور بنیادی مسئلہ پورنوگرافی کا ہے جس پر آج کی گفتگو میں بات کی جائے گی۔

انسانوں کی ساخت

پورنوگرافی کی تاریخ شاید اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود انسان ہے۔ اس کا ماخذ انسان کی وہ ساخت ہے جس میں انسانیت کے تسلسل کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصی اہتمام کیا کہ مرد و زن کے تعلق کو محض ایک حیوانی تعلق سے کہیں آگے بڑھا کر اسے ایک انتہائی پرکشش نفسیاتی تجربہ بنا دیا ہے۔ یہ نفسیاتی کشش ایک طویل رفاقت کو جنم دیتی ہے۔ یہ طویل رفاقت اس بچے کا واحد سہارا ہے جو تمام حیوانات میں سب سے کمزور پیدا ہوتا ہے اور اسے ایک عرصے یعنی دس بارہ برس تک والدین کے تحفظ اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

چنانچہ اسی حکمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے تعلق کو دیگر جانوروں کی طرح ایک سادہ حیوانی تعلق کے طور پر نہیں بنایا جو ایک مختصر وقت کے لیے ملتے ہیں اور پھر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ بلکہ اس تعلق کو جبلت سے اٹھا کر نفسیات، ذوق جمال اور احساس لذت سے متعلق کر دیا گیا ہے۔ اور اس درجہ میں متعلق کر دیا گیا ہے کہ بہت سے ماہرین نفسیات انسان کی تشریح اسی حقیقت کو بنیاد بنا کر کرتے ہیں اور انسان کے ہر فکر و عمل کو اسی کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

خدا کی حکمت

انسان کی اسی ساخت کی بنا پر انسان ہمیشہ میاں بیوی اور خاندان کی شکل میں مل کر رہتے ہیں۔ اس رشتے کی صورت میں محبت کا وہ تعلق قائم ہو جاتا ہے جو زندگی کے ہر سرد و گرم میں انسان کو مقابلے کی ہمت دیتا، بچوں کی نگہداشت کا بوجھ اٹھاتا اور بزرگوں کی ذمہ داری اس طرح اٹھاتا ہے کہ آخری آرامگاہ تک انھیں اپنے کندھوں پر چھوڑ کر آتا ہے۔

یہی خدا کی اصل اسکیم تھی۔ اسی بنا پر انسان کو جانوروں سے مختلف بنایا گیا تھا۔ مگر خدا کی حکمت بالغہ نے اسی جذبے سے انسانوں کا سب سے بڑا امتحان بھی تخلیق کر دیا جس کا اظہار اولین انسانوں یعنی حضرت آدم وحوا کی شکل میں ہو گیا۔ اسی واقعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ یہ تعلق انسانوں کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔

چنانچہ شیطان ساری انسانی تاریخ میں اسی راستے سے انسانوں پر حملہ آور ہوتا رہا ہے اور تکبر کے بعد یہ انسانوں کو ہلاک کرنے والی دوسری سب سے بڑی اخلاقی برائی ثابت ہوئی ہے۔ اس کی انتہائی شکل تو زنا اور بدکاری ہی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں شدید سزا کی وعید سنائی ہے۔ مگر اس سے کم تر چیزوں سے روکنا بھی ہمیشہ سے مصلحین کا طریقہ رہا ہے۔ مگر انسان ہمیشہ زنا میں بھی پڑے اور کمتر چیزوں سے بھی وابستگی ان کا طریقہ رہی ہے۔

دور جدید میں پورنوگرافی کا عالمی ظہور

دور جدید میں مغربی تہذیب نے ایک طرف عفت کے تصور کو پامال کیا ہے اور دوسری طرف زنا سے قریب کر دینے والی چیزوں کی بھی نت نئی شکلیں ایجاد کی ہیں۔ پورنوگرافی ایسی ہی ایک چیز ہے جس کا آغاز کیمرے کی ایجاد کے ساتھ ہوا۔ پہلے پرنٹ میڈیا اور پھر الیکٹرونک میڈیا سے یہ چیزیں عام لوگوں تک پھیلنا شروع ہوئیں۔ مگر ایک تو انسانی معاشرے عمومی طور پر ان چیزوں کو بہت زیادہ پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ دوسرے یہ کہ اس طرح کی چیزیں بنانے والے لوگ ظاہر ہے کہ فی سبیل اللہ تو یہ کام کرتے نہیں تھے۔ اس لیے اس کام میں پیسہ خرچ کرنا پڑتا

تھا۔ چنانچہ معاشی اور سماجی عوامل کی بنا پر ان کا دائرہ محدود ہی رہا۔

یہ صورتحال اسی طرح رہی یہاں تک کہ پچھلی صدی کے اختتامی عشرے میں انٹرنیٹ کی ایجاد ہوئی۔ انفارمیشن ایج کا عظیم دھماکہ (Information Big Bang) ہوا۔ جس کے بعد یہ سارا مواد انٹرنیٹ پر منتقل ہونا شروع ہوگیا۔ ابتدا میں تو انٹرنیٹ پر بھی یہ فحش مواد پیسوں کے عوض دستیاب تھا۔ مگر انٹرنیٹ پر ملنے والی پرائیویسی اور فحش مواد کی آسان دستیابی کی بنا پر یہ تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ پیسوں کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ لوگ اس میدان میں اترنے لگے۔ اس وقت پورن انڈسٹری کی سالانہ آمدنی 97 ارب ڈالر ہے۔ اس کے مقابلے میں ہالی وڈ کی آمدنی دس ارب ڈالر سالانہ اور بالی وڈ کی دو ارب ڈالر سالانہ کے لگ بھگ ہے۔ ان دو بین الاقوامی اور سب سے بڑی فلم انڈسٹریز کی آمدنی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باقی دنیا کی چھوٹی چھوٹی اور مقامی فلم انڈسٹری کو ملا کر بھی ان سب کی مجموعی آمدنی پورن انڈسٹری کی آمدنی سے کم ہی ہوگی۔

پورنوگرافی کے پھیلنے کی وجوہات

تاہم جیسا کہ اصول ہے کہ جب زیادہ لوگ کسی میدان میں اترتے ہیں تو مقابلہ بڑھ جاتا ہے۔ دوسری محدودیت پورن انڈسٹری کی یہ تھی کہ اس کی جتنی زیادہ طلب معاشرے میں موجود ہے، اس کے اشتہارات پر اتنی ہی پابندیاں عائد ہیں۔ ان کا اشتہار نہ کسی چینل پر شائع ہوسکتا ہے نہ کسی اخبار میں۔ حتیٰ کہ بڑی ویب سائٹس جو اشتہارات ہی پر چلتی ہیں وہ بھی ان کا اشتہار عوامی مفاد میں نہیں لگاتیں۔

چنانچہ اس صورتحال کا حل ان لوگوں نے یہ نکالا کہ اپنا مواد بلا معاوضہ نیٹ پر پھیلانا شروع کردیا۔ انھیں سہولت یہ تھی کہ انٹرنیٹ پر کسی ویب سائٹ کو تلاش کرنے کے لیے صرف ایک سرچ انجن پر اپنی مطلوبہ چیز کا نام لکھنا ہوتا ہے اور اس کی دستیابی کے تمام ذرائع اگلے لمحے میں سامنے

ہوتے ہیں۔ چنانچہ لوگ مفت کی پورنوگرافی ذوق وشوق سے دیکھنے لگے۔ یہ چیزیں مفت فراہم کرنے کے پیچھے خدمت خلق کا جذبہ نہیں بلکہ انسانی نفسیات کا یہ مطالعہ تھا کہ فواحش اور بدکاری وہ چیزیں ہیں جن کی لت لگ جایا کرتی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ جب کوئی شخص ان فری پورن ویب سائٹس پر آنے لگتا ہے تو تھوڑے ہی عرصے میں اس کی طلب ختم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتی ہے۔

اس صورتحال کو مزید خراب ٹیکنالوجی کی ترقی کے دو اور پہلوؤں نے کیا۔ایک یہ کہ انٹرنیٹ کی رفتار بڑھتی چلی گئی۔ پہلے پہل جہاں تصویر ڈاؤن لوڈ کرنا بھی ایک صبر آزما کام تھا وہاں اب اعلیٰ ترین کوالٹی کی ویڈیو یا فلم کا دیکھنا بھی بہت آسان ہے۔ دوسری طرف اسمارٹ فون کی آمد نے کمپیوٹر کو جیب میں پہنچا دیا۔ یوں دیکھنے والوں کا ذوق وشوق بھی بڑھا اور ان کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ پورنوگرافی ایک مرض کی طرح دنیا بھر میں پھیل چکا ہے۔

اب اس کے معاشرتی اور اخلاقی اثرات سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ان میں میاں بیوی کے تعلق کی کمزوری اور خاندان کا ٹوٹ جانا، غیر حقیقی تصورات اور توقعات کی بنا پر ازدواجی مسرت کا خاتمہ، بچوں اور نوجوانوں کا غلط تصورات اور رویوں کا شکار ہونا، خواتین کے خلاف جرائم میں اضافہ وغیرہ نمایاں ہیں۔ تاہم یہ اثرات ابھی بہت ہلکے ہیں۔اس لیے کہ اِس دور میں پورنوگرافی کا عروج شروع ہوا ہے۔اس کے مکمل اثرات آنے والے برسوں میں سامنے آئیں گے جب اگلی نسلیں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے پروان چڑھیں گی۔

پاکستان کا مسئلہ

پاکستان میں اس حوالے سے صورتحال زیادہ خراب ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں پورنوگرافی دیکھنے کا عمل دوسرے ممالک کے مقابلے میں کہیں

زیادہ ہے۔ حالانکہ پاکستان میں پورن ویب سائٹس بلاک ہیں اور عام طریقے سے ان کا دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ مگر اب پورنوگرافی اتنی پھیل چکی ہے اور دوسری طرف اتنے چور راستے کھل چکے ہیں کہ صرف سنسر شپ سے اس کو نہیں روکا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کچھ اور اقدامات کی ضرورت ہے جن پر ہم توجہ دلانا چاہیں گے۔

ان اقدامات کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ مغربی اور دیگر اقوام عالم میں تربیت کا کچھ نہ کچھ متبادل نظام باقی ہے اور وہاں قانون کی حکمرانی ہے۔ چنانچہ وہ پورنوگرافی دیکھ کر بھی جرائم پر اس طرح جری نہیں ہوتے۔ مزید یہ کہ وہاں کے معاشرے اس طرح بند معاشرے نہیں ہیں جیسا کہ ہمارا معاشرہ ہے۔ بند معاشرے جب کھلتے ہیں تو بہت سی حدود پامال کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا اظہار ہمارے ہاں معصوم بچے بچیوں سے زیادتی کے وہ واقعات ہیں جو تشویشناک حد تک بڑھ چکے ہیں۔

اصلاح احوال کا راستہ

اس حوالے سے پہلی چیز تربیت کا عمل ہے خاص کر مردوں کی تربیت۔ ہمارے مذہبی فکر کا یہ المیہ ہے کہ وہ اس معاملے میں ہمیشہ احکام دین کو خواتین کے پہلو سے پیش کرتا ہے اور ان کے مکمل پردے، ان کا دائرہ عمل گھر تک محدود کرنے اور مرد و زن کے اختلاط پر مکمل پابندی لگانے کو دین کی تعلیم کا اصل منشا سمجھتا ہے اور اسی کو بیان کرتا ہے۔

آپ غور کیجیے کہ یہ تینوں چیزیں پورنوگرافی کو دیکھنے سے کسی طور مردوں کو نہیں روک رہیں جو زیادہ تر اس فتنے کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ دین کی اصل قرآنی تعلیم اس معاملے میں تربیت کا آغاز مردوں سے یہ کہہ کر کرتی ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو بچا کر رکھیں۔ یہ حکم سامنے رکھتے ہی تمام پورنوگرافی خود بخود اس کی زد میں آ جاتی ہے۔

چنانچہ سب سے پہلی اصلاح جس کی ضرورت ہے وہ تربیت کے اس بنیادی تصور کو بدلنے کی

ہے جس میں عورت ہی کو مخاطب کر کے پردے کے احکام سنا دیے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مرد وزن دونوں کو بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ انھیں یہ حکم دیتے ہیں کہ دونوں اپنی نگاہوں کو آلودہ ہونے سے بچائیں۔ یہ عام زندگی میں بھی ہوگا اور انٹرنیٹ پر بھی ضروری ہوگا۔ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے ان کا واسطہ اس ہستی سے ہے جس سے نہ نگاہوں کی خیانتیں چھپی رہتی ہیں اور نہ دل کے خیالات اس سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ چنانچہ نگاہوں کو آوارگی سے بچانا، جو قرآن کا اس باب میں پہلا بنیادی حکم ہے، اس کو سامنے رکھتے ہی لوگوں کے پاس وہ اخلاقی اور دینی بنیاد آجاتی ہے جس کی بنا پر ان کا ضمیر ان کو اس وقت اس برائی میں پڑنے سے روکے گا جب دوسرا کوئی روکنے والا موجود نہیں ہوتا۔

دوسری اہم چیز یہ حقیقت ہے اور جس کی طرف ہم نے پیچھے توجہ دلائی ہے کہ جنسی بگاڑ ایک نشہ، ایک لت اور خارش کے مرض کی طرح ہوتا ہے۔ خارش کے مرض میں ایک دفعہ کا کھجانا وقتی سکون دیتا ہے مگر اس کے بعد خارش اور بڑھ جاتی ہے۔ نشہ کی وقتی تسکین اگلی دفعہ زیادہ طاقت سے اور زیادہ مقدار میں نشہ کا مطالبہ سامنے کر دیتی ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر نہ صرف زنا کو حرام قرار دیا گیا ہے بلکہ اس کے قریب جانے سے بھی منع کر دیا گیا ہے کہ اس کی طرف لے جانے والے عوامل ایک مقناطیس کی طرح ہر اس شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جو ان کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس دائرے سے باہر رہنا ہی عافیت کا راستہ ہے۔ اس پس منظر میں ضروری ہے کہ لوگوں کو اس حوالے سے مسلسل تنبیہ کی جائے کہ اللہ نے زنا ہی سے نہیں روکا بلکہ اس کے قریب جانے سے بھی روکا ہے۔ اس حکم کی بار بار یاد دہانی سے انسان پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ محتاط زندگی گزارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مزید یہ اہتمام کیا ہے کہ وہ دائرہ جس کے اندر وہ انسانوں کو رکھنا چاہتے ہیں وہ انھوں نے خود بیان بھی کر دیا ہے۔ یہ دائرہ نگاہ کی حفاظت سے شروع ہوتا ہے، باحیا لباس کے

انتخاب سے ہوتا ہوا خواتین کے لیے نامحرموں کے سامنے زیب وزینت کی نمائش کی ممانعت پر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ وہ فطری دائرہ ہے جس میں انسان رہیں تو عام طور پر کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔

ہمارے ہاں روایتی طور پر پردے کے جو تصورات پیش کیے جاتے ہیں وہ معاشرے کی اکثریت ناقابل عمل سمجھ کر اختیار ہی نہیں کرتی۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتے ہیں اور اس حد کو بھی پامال کرتے ہیں جو واقعتاً دین کا مطالبہ ہے۔ اس کے برعکس جب اصل احکام توازن کے ساتھ بیان کیے جائیں گے تو لوگ ان کو زیادہ قابل عمل پاکر ان کو اختیار کریں گے۔ جس کے نتیجے میں معاشرے کی عظیم اکثریت حدود آشنا زندگی گزارے گی جس سے مجموعی طور پر معاشرے میں خیر بڑھے گا۔

تیسری چیز جس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ فلم اور میڈیا انڈسٹری کو اب اجتماعی زندگی سے نہیں نکالا جاسکتا۔ البتہ ان کو حدود آشنا بنایا جاسکتا ہے۔ ان کو حدود آشنا بنادیا جائے تو بین الاقوامی مقابلے اور انفارمیشن ایج کے اس دور میں یہ آپ کی دفاعی لائن بن سکتے ہیں۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہمارے لوگ زیادہ تر ہالی وڈ اور بالی وڈ کی فلمیں اور پروگرام دیکھتے ہیں۔ ان کے نیم عریاں مناظر جو عام طور پر ان کا لازمی حصہ ہوتا ہے وہ پہلا ذریعہ ہوتے ہیں جو ایک عام ناظر کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ مکمل عریاں اور فحش فلمیں دیکھے۔

چنانچہ ایسے میں ضروری ہے کہ پاکستان میں اس معاملے پر توجہ دی جائے اور میڈیا انڈسٹری کے لوگوں کو نیکی کا یہ سبق نہ پڑھایا جائے کہ انھیں اپنا کام چھوڑ کر تبلیغ میں لگنا ہوگا۔ بلکہ یہ بتایا جائے کہ تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ نے آپ کو پہلے ہی دے رکھا ہے۔ بس اس کو دینی حدود میں رہ کر استعمال کریں۔ مگر اس کے لیے ان اہل علم کی یہ رائے ماننی پڑے گی جو مطلقاً ان چیزوں کی حرمت کے قائل نہیں بلکہ اخلاقی حدود میں رکھنے کے قائل ہیں۔ یہ بات ہماری مذہبی فکر کو گوارا

نہیں۔اس لیے امکان یہی ہے کہ نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

بہرحال اس معاملے میں سب سے اچھی مثال خود پاکستان ہی میں موجود ہے۔ ہماری مراد سن اسی کی دہائی کے وہ ڈرامے ہیں جن میں لکھاری، اداکار، صداکار اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ رکھتے تھے اور ان اخلاقی قباحتوں سے دور تھے جو عام طور پر میڈیا کا خاصہ ہوتا ہے۔ ہمارا سماجی زوال دیگر شعبوں کے ساتھ میڈیا میں بھی آ گیا ہے، مگر حال ہی میں ایران اور ترکی نے ڈراموں کے شعبے میں کافی کام کیا ہے اور بعض پہلوؤں سے بہت کامیاب رہے ہیں۔

اس کے علاوہ عملی طور پر معاشی مسائل کی بنا پر شادیوں کی تاخیر ایک بہت بڑا سبب ہے جس کی بنا پر لوگ پورنوگرافی دیکھتے ہیں۔ بلوغت کے بعد پندرہ بیس سال تک جو نوجوان غیر شادی شدہ رہے گا، امکان یہی ہے کہ وہ ان چیزوں میں پڑے گا۔اور چونکہ یہ ایک نشہ ہے اس لیے جس کو یہ نشہ لگ جائے وہ شادی کے بعد بھی اس نشے کا شکار رہتا ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس اہم سماجی مسئلے کو لوگ اپنی اپنی سطح پر حل کرنے کی کوشش کریں۔ بچوں کی شادی مناسب وقت پر کرنے کی فکر کریں اور اس میں غیر ضروری تاخیر نہ کریں۔

نشہ کا علاج

ایک آخری سوال اس حوالے سے ان لوگوں کا ہے جو اس نشے کے عادی ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس نشے کا شکار ہو جاتے ہیں وہ بڑی مشکل میں آ جاتے ہیں۔ ایک طرف ان کا ضمیر انھیں مسلسل ملامت کرتا ہے اور دوسری طرف جو لوگ ضمیر کی چبھن کا اس طرح شکار نہیں ہوتے وہ خوف کا شکار ضرور رہتے ہیں۔اس لیے کہ معاشرے میں یہ چیز بڑی ناگوار سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ ہمیشہ یہ خوف انھیں دامن گیر رہتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا۔ان تمام

پہلوؤں سے لوگوں کی نفسیات پر بہت منفی اثر پڑتا ہے۔

اس نشے سے نکلنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے دور رہے جو اس طرف لے کر جاتی ہیں۔ انٹرنیٹ بس ضرورت کی حد تک استعمال کریں۔ جب استعمال کریں تو تنہائی میں نہ کریں۔ اس طرح کے کسی مواد پر نظر پڑے تو فوراً پہلے لمحے میں اس جگہ سے ہٹ جائیں۔ عام حالات میں ٹی وی وغیرہ دیکھتے ہوئے بھی کوشش کریں کہ ہر اس منظر سے دور رہیں جو ان کی اخلاقی آلودگی کا باعث بن رہا ہے۔ نماز، مسجد کا اہتمام، باوضو رہنا، اچھی صحبتیں بھی اس مسئلے کے حل میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اور ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ بے کار نہ بیٹھیں بلکہ خود کو کسی نہ کسی مثبت کام میں مصروف رکھیں۔ بے کار انسان کا ذہن شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے لیے کوئی مثبت مقصد تلاش کریں اور خود کو اس میں مصروف رکھیں۔

اس سب کے باوجود اگر غلطی ہو جائے تو اس کے اثر سے نکل کر فوراً توبہ کریں۔ آئندہ بچنے کا عزم کریں۔ دو نفل پڑھ کر توبہ کریں۔ کچھ صدقہ و خیرات کریں۔ کیونکہ نیکی برائی کو دور کر دیتی ہے۔ شیطان جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کو ہر دفعہ برائی کی طرف لانے کا نتیجہ مسلسل توبہ اور مزید نیکیوں کی شکل میں نکلتا ہے تو اس کی وسوسہ انگیزی خود ہی کم ہو جائے گی۔ پھر بھی کبھی خود ہی اس طرف رجحان ہو تو پچھلے تجربے کو یاد کریں کہ آخر کار ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ انسان ایک ذہنی مخلوق ہے اور مسلسل تربیت کے نتیجے میں انسان بدل جاتا ہے۔ انشاء اللہ اس عمل کے نتیجے میں آپ بھی بدل جائیں گے۔ مختصر یہ کہ کبھی مایوس نہ ہوں اور نیکی کی راہ کبھی نہ چھوڑیں۔ انشاءاللہ یہ عادت چھوٹ جائے گی۔

جہاں رہیے اللہ کے بندوں کے لیے باعث رحمت بن کر رہیں، باعث آزار نہ بنیں۔

سوال وجواب

ابویحییٰ

جزاوسزا کا خدائی قانون اور دنیا کی بے خبری

السلام علیکم

محترم ابویحییٰ صاحب! میرا سوال یہ ہے کہ قانون اتمام حجت کا مقصد آپ نے اپنی کتابوں میں یہ بتایا ہے کہ اس سے باقی دنیا کی اقوام بنی اسرائیل یا مسلمانوں کو دیکھ کر قانونِ جزاوسزا کا نظارہ اسی دنیا میں کر سکتے ہیں۔لیکن جناب اگر یہ چیز اتنی ہی واضح اور عالمی سطح پر ثابت شدہ ہے تو کبھی کسی غیر مسلم نے تاریخ پڑھ کے اس قانون کو دریافت کیوں نہیں کر لیا؟ میں ''کیرن آرمسٹرانگ''(Karen Armstrong) کا ذکر کرنا چاہوں گا جو کہ ایک غیر جانبدار (unbiased) مصنفہ ہے۔اوراس نے اسلام کو پڑھا بھی ہے، اس پر یہ چیز کیوں واضح نہ ہوئی اوراگر کوئی ایک بھی غیر مسلم اس بات کو نہ سمجھ سکا تو پھراس کا کیا فائدہ ہوا کیوں کہ اصل میں تو یہ جزاوسزا انھی کے لیے برپا کی گئی تھی؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت کریں،معیز افضل۔

جواب: محترمی ومکرمی

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

دیکھیے ،اس دنیا میں بنی اسرائیل اوراب عربوں کے ساتھ تاریخ کے پچھلے چار ہزار برسوں میں جو کچھ ہورہا ہے وہ خدا کی جزاوسزا کا ظہور ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ یہ غداری کریں گےاورایمان واخلاق کی دعوت کواپنی زندگی نہیں بنائیں گےتو دنیا میں ذلت اور مغلوبیت کا شکار ہوں گے۔اور اگراس دعوت کواپنائیں گےاور دنیا کے سامنے حق کی شہادت دیں گےتو دنیا میں غلبہ اوراقتدار پائیں گے۔ان کی یہ جزاوسزا اپنی اس نوعیت میں باقی انسانیت پرحق کی شہادت دیتی ہے۔

اس پر اگر آپ کا اعتراض یہ ہے کہ کسی غیر مسلم نے یہ بات دریافت نہیں کی تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس طرح کی شہادت حالات کی زبان میں حجت پوری کرتی ہے چاہے کوئی اسے دریافت کرے یا نہ کرے۔ یہ قیامت کے دن لازماً حجت بنے گی۔

اس کی نوعیت کو ایک مثال سے سمجھیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سورہ اعراف آیت 172 میں اللہ تعالیٰ نے عہد الست کے واقعہ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ تمام انسانیت کا اللہ کے حضور پیش ہوکر اس کی ربوبیت کا اقرار کرنا قیامت کے دن ان کے خلاف حجت بنے گا تاکہ قیامت کے دن کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اسے اللہ کے بارے میں پتہ نہ تھا۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ یہ بات قرآن کے بیان کرنے سے پہلے یا بعد میں کس غیر مسلم عالم یا فلسفی نے دریافت کی ہے؟

ظاہر ہے کہ کسی نے یہ بات نہ دریافت کی نہ بیان کی۔ لیکن فطرت کی یہ حجت اتنی واضح ہے کہ اس پر شاید بحث کی زیادہ ضرورت نہیں۔ یہی معاملہ اس جزا و سزا کا ہے جو آل ابراہیم کے ساتھ پچھلے چار ہزار برس سے ہورہی ہے۔ تورات میں یہ پورا قانون بیان ہوا ہے۔ قرآن میں کئی جگہ اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ ان کی چار ہزار سالہ تاریخ زندہ ثبوت بن کر انسانیت کے سامنے موجود ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس پر لوگوں کو متوجہ کریں اور اپنی بھی اصلاح کرکے اس سزا سے نکلیں جس کا ہم شکار ہیں اور انسانیت پر بھی حق کی شہادت دیں۔

امید ہے کہ آپ کا اشکال رفع ہوگیا ہوگا۔

والسلام

ابو یحییٰ

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (58)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی درست اساسات: انابت اور توبہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ سے تعلق کی جو بنیادی اساسات بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک بنیادی اساس انابت اور توبہ اور اسی کے ذیل میں اوّابیت کا وصف ہے۔ انابت اللہ کی طرف متوجہ رہنے کا جذبہ ہے۔ انابت خدا کے ہمہ وقت جاری فیضان سے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر کو پانے کا نام ہے۔ یہ جذبہ اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی ہستی ایک انتہائی طاقتور، باکمال، مگر بڑی رحیم و کریم اور عطا و بخشش والی ہستی ہے۔ اس کا فیضان ہر لحظہ بٹ رہا ہے۔ اس کی عطا ہر لمحہ جاری ہے۔ اس کی ہستی سراپا کرم اور اس کا وجود سراپا بخشش ہے۔ وہی ان داتا ہے۔ وہی دادرسا ہے۔ چنانچہ بندہ عاجز اس فیض لم یزل کی برسات سے ہر لمحہ اپنا دامن بھرنا چاہتا ہے۔

خدا کی بارگاہ سے اس عبدِ منیب کو جو چیز سب سے بڑھ کر ملتی ہے وہ ہدایت اور توفیق ہے۔ اس لیے کہ مادی چیزیں تو اسباب کی دنیا میں امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں۔ یہ خدا کا اصل خزانہ نہیں، ایک متاع قلیل ہے جو ہر نیک و بد کو دیا جاتا ہے۔ مگر جب اس کی ہدایت اور توفیق ملتی ہے تو پھر انسان کو جنت کے رستوں کا نشان مل جاتا ہے۔ اسے ایمان کی غذا، معرفت کی خوراک، عمل کی توفیق اور تقویٰ کا زادراہ دے دیا جاتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو قیامت کے دن خدا کے ہر خزانے کو انسان کی دسترس میں کردیں گی۔

تاہم انسان کمزور ہے۔ وہ خطا کا پتلا ہے۔ اس سے بھول چوک ہوجاتی ہے۔ اس پر غفلت

طاری ہوجاتی ہے۔اس کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔اس کے قدم پھسل جاتے ہیں۔چنانچہ بندہ غلطی بھی کرتا ہے۔نافرمانی بھی ہوجاتی ہے۔معصیت کا صدور بھی ہوجاتا ہے۔جرم کا ارتکاب بھی ہوجاتا ہے۔مگر یہ لمحہ بھر کی بات ہوتی ہے۔جذبات کی آندھی جیسے ہی ٹھنڈی پڑتی ہے۔غفلت کا سایہ جیسے ہی دور ہوتا ہے۔گناہ کا نشہ جیسے ہی اترتا ہے۔یہ انابت انسان کو یاددلاتی ہے کہ وہ اپنے مالک کا بندہ ہے۔مالک بھی وہ جولمحہ لمحہ کی خبر رکھتا ہے۔جولفظ لفظ کو جانتا ہے۔جو نگاہ کی خیانتوں اور سینے کے رازوں سے باخبر ہے۔جس کے فرشتے ہر چیز کو لکھتے ہیں۔جس کے حضور ہر عمل کی پیشی ہوگی۔

یہ احساس انسان کو تڑپا دیتا ہے۔بجائے اس کے کہ وہ غلاظت میں لوٹتا رہے،وہ اپنے رب کی طرف لوٹتا ہے۔قدم پھسلتے ہی وہ سنبھلتا ہے اور دامن جھاڑ کر مالک کے حضور پیش ہوجاتا ہے۔وہ شیطان کی باگ تڑا کر،نفس سے ہاتھ چھڑا کر اپنے مالک کے در پہ آپڑتا ہے۔وہ کریم آقا اورمہربان رب کے حضور رجوع کرتا ہے۔روتا ہے۔گڑگڑاتا ہے۔فریاد کرتا ہے۔اپنے مالک سے معافی مانگتا ہے۔اپنی خطا پر توبہ کرتا ہے۔اپنے گناہ پر شرمسار ہوتا ہے۔اپنی بدی کو برا جانتا ہے۔اپنے انجام سے ڈرتا ہے۔اپنی رسوائی کے اندیشہ سے گھبراجاتا ہے۔

جب بندہ اس طرح شرمساری کے ساتھ رجوع کرتا اورلوٹتا ہے تو اس کا مالک بھی لوٹ آتا ہے۔اس لیے کہ وہ کریم ہے۔اس کی خُو درگزر کی ہے۔وہ فوراً کبھی نہیں پکڑتا۔وہ ہمیشہ موقع دیتا ہے۔وہ مہلت دراز کرتا ہے۔رکا رہتا ہے۔انتظار کرتا ہے۔پلٹ کر دیکھتا ہے کہ شاید غلام لوٹ آئے،لونڈی واپس آجائے۔اورکوئی غلام لوٹ آئے۔کوئی لونڈی واپس آجائے تو ڈانٹتا نہیں۔شرمندہ نہیں کرتا۔ذلیل نہیں کرتا۔طعنے نہیں دیتا۔پچھلا کھاتہ کھول کر رسوا نہیں کرتا۔فردقرارداد جرم نہیں سناتا۔معاف کردیتا ہے۔گناہ دھودیتا ہے۔بدی کو صاف کردیتا ہے۔جیسے ماں بچے کی

غلاظتوں کو دھوتی ہے، اسے نہلاتی ہے اور اس کو صاف ستھرا کر دیتی ہے۔

تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ توبہ میں کبھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اس راہ کی تاخیر بارہا توفیق سلب کر دیتی ہے۔ گناہ انسان کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ ندامت کی جگہ سرکشی، احساس کی جگہ بے حسی اور رجوع کی جگہ غفلت لے لیتی ہے۔ انسان میں سے لوٹ آنے کی استعداد ختم ہو جاتی ہے۔ پھر ایک روز مہلت عمل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے زمانے کا فرعون ہو تب بھی اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔ مگر اس وقت فریاد کام آتی ہے نہ التجا۔ توبہ کام آتی ہے نہ ندامت۔ بس خدا کی پکڑ بچتی ہے۔ جو دردناک بھی ہے اور بہت سخت بھی۔

اوّابیت کا وصف

اس برے انجام سے بچنے کا طریقہ انابت کی زندگی ہے جو انسان کو خدا کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ غلطی ہو جائے تو یہی انابت فوراً رجوع اور توبہ پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ رجوع اور یہ توبہ جو انابت کا صلہ ہے، ان لوگوں میں درجہ کمال پر ہوتی ہے جو اواب ہوتے ہیں۔ اواب کے لوٹنے میں اور عام لوگوں کی توبہ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ توبہ تو گناہ گار کرتے ہیں۔ اواب گناہ نہیں کرتے، ان کا تو ارادہ گناہ اور اجتہادی خطا بھی ان کے لیے بمنزلہ گناہ ہوتا ہے۔ دوسرے سرکشی کر کے بھی شرمندہ نہیں ہوتے اور یہ ساری نیکیوں کے باوجود خود کو مجرم سمجھتے ہیں۔ دوسرے غفلت شعاری میں خوش رہتے ہیں اور یہ بندگی کی روش میں جی کر بھی خود کو غافل سمجھتے ہیں۔ دوسرے نیکیاں نہیں کرتے پھر بھی خود کو نیک سمجھتے ہیں اور یہ ساری نیکیاں کر کے بھی خود کو خطار کار سمجھتے ہیں۔

ایسے صالحین اول تو بہت محتاط زندگی گزارتے ہیں۔ مگر کبھی انسانی عجز کی بنا پر بھول چوک

ہو جائے، یا کسی گندگی میں قدم پڑنے لگیں یا کبھی وقتی اور لمحاتی غفلت طاری ہو جائے یا کسی فرمان کی پاسداری نہ ہوسکے تو یہ بتائے جانے سے پہلے سمجھ جاتے ہیں۔ تنبیہ سے پہلے لوٹ آتے ہیں۔ سونے سے پہلے جاگ جاتے ہیں۔ ان کی توبہ، ان کی تڑپ اوران کا رجوع سب بے مثال ہوتے ہیں۔ ان کی معافی کے الفاظ لوگوں کے لیے ضرب المثل بن جاتے ہیں۔ ان کی توبہ کا طریقہ لوگوں کے لیے قابل اتباع بن جاتا ہے۔ ان کے دل کی تڑپ صدیوں گناہ گاروں کے دلوں کو گرماتی رہتی ہے۔ ان کی توبہ کی کہانی نسل درنسل سنائی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لوٹنے پر ان کو معافی ہی نہیں ملتی، ان کے سر کو سرفراز بھی کیا جاتا ہے۔ آدم کو نبی بنا دیا جاتا ہے۔ داؤد کے سر پر بادشاہی کا تاج رکھا جاتا ہے۔ سلیمان کی بادشاہی کو بے مثال بنا دیا جاتا ہے۔ ایوب کی نعمتوں اور سرداری کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ یونس کو مچھلی کے پیٹ سے نکال کر قوم کی سرداری دے دی جاتی ہے۔

خدا ان اوابین کو اپنے قدموں سے اٹھاتا ہے۔ اپنے قرب کی منزلت عطا کرتا ہے۔ ان کے آنسوؤں سے انھیں غسل ہی نہیں دیتا، موتی بنا کر اپنے خزانے میں جمع کر لیتا ہے۔ خدا یہ کہہ کر ان کی تحسین کرتا ہے کہ نعم العبد اور بندہ جواب میں کہتا ہے کہ نعم المولیٰ و نعم النصیر۔

انابت سے لے کر اوابیت کا یہ سفر بندگی کی معراج ہے۔ جو اس معراج کو نہیں پہنچا وہ خدا کا قرب نہیں پاسکتا۔ چاہے وہ خود کو کچھ بھی سمجھتا رہے۔ چاہے دنیا اسے کچھ بھی سمجھتی رہی۔

قرآنی بیانات

”(یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ) اللہ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ وہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اُن لوگوں کے لیے کوئی توبہ نہیں ہے جو گناہ کیے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آ جاتا

ہے، اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔ (اِسی طرح) اُن کے لیے بھی توبہ نہیں ہے جو مرتے دم تک منکر ہی رہیں۔ یہی تو ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک سزا تیار کر رکھی ہے۔''، (النسا4:18-17)

''مگر یہ کہ جس نے توبہ کر لی اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے تو اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اللہ بڑا بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ اور جو توبہ کرے اور اچھے عمل کرے، (اُس کو مطمئن ہونا چاہیے)، اِس لیے کہ وہ پوری سرخ روئی کے ساتھ اللہ ہی کی طرف لوٹتا ہے۔''، (الفرقان25:71-70)

''اِن میں سے، البتہ جو توبہ کریں اور (اپنے اِس طرزِ عمل کی) اصلاح کر لیں اور (جو کچھ چھپاتے تھے، اُسے) صاف صاف بیان کر دیں تو اُن کی توبہ میں اپنی شفقت سے قبول کر لوں گا اور (حقیقت یہ ہے کہ) میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں، میری شفقت ابدی ہے۔''، (البقرہ2:160)

''بنی اسرائیل کو، (اِس کے بعد) ہم نے سمندر پار کرایا تو فرعون اور اُس کے لشکروں نے سرکشی اور شرارت کی راہ سے اُن کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا: میں نے مان لیا کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔ کیا اب! اِس سے پہلے تو تم نافرمانی کرتے رہے اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھے۔''، (یونس10:91-90)

''اِن سے کہو کہ میرے بندو، جنھوں نے (میرے شریک ٹھیرا کر) اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ تم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اُس کے فرماں بردار بن جاؤ، اِس سے پہلے کہ تم پر اُس کا عذاب آ جائے۔ پھر تمھاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔''، (الزمر39:54-53)

''اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اُس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی، (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم رکھو اور اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ تم جس چیز کی طرف

اِن مشرکوں کو بلا رہے ہو (کہ یہ خدا کو ایک مانیں)، وہ اِن پر بہت شاق گزر رہی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے، لیکن اپنی طرف آنے کی راہ وہ اُنھی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔''، (شوریٰ 13:42)

'' (اِس کی پیروی کرو)، تم سب اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اور اُس سے ڈرتے رہو اور نماز کا اہتمام رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔''، (الروم 31:30)

''یہ منکرین کہتے ہیں کہ اِس کے پروردگار کی طرف سے اِس شخص پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ اِن سے کہہ دو، اللہ جس کو چاہتا ہے (اپنے قانون کے مطابق اِسی طرح) گمراہ کر دیتا ہے اور اپنا راستہ اُنھی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف متوجہ ہوں۔''، (الرعد 27:13)

''ہر اُس بندے کی بصیرت اور یاد دہانی کے لیے جو توجہ کرنے والا ہو۔''، (ق 8:50)

''یہی وہ چیز ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اُس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا اور اپنے پروردگار کے حدود کی حفاظت کرنے والا تھا۔ جو بن دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا اور ایسا دل لے کر حاضر ہوا ہے جو (خدا کی طرف) متوجہ رہتا تھا۔''، (ق 32:50)

''تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے، اُسے تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے۔ اگر تم سعادت مند رہو گے تو پلٹ کر آنے والوں کے لیے وہ بڑا درگذر فرمانے والا ہے۔''، (اسراء 25:17)

''اور (فرمایا کہ) اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا لو اور اُس سے (اپنے آپ کو) مارو اور (اپنے کو سزا دینے کی جو قسم تم نے کھالی تھی، اُس میں) حانث نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اُسے (ہر حال میں) صابر پایا۔ کیا ہی خوب بندہ تھا! کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔''، (ص 44:38)

''اور داؤد کو ہم نے سلیمان (جیسا بیٹا) عطا کیا۔ کیا ہی خوب بندہ تھا! کچھ شک نہیں کہ وہ خدا کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔''، (ص 30:38)

''یہ جو کچھ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو، (اے پیغمبر)، اور بڑی قوت کے مالک، ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔''، (ص 17:38)

ڈاکٹر شہزاد سلیم/ محمد محمود مرزا

شہد کی مکھی بنیے

فطرت اور اس کے عوامل ہم انسانوں کے لیے بہترین معلم ہوتے ہیں بشرطیکہ ہم ان سے سیکھنے والے بنیں۔ اِنہیں معلمین میں سے ایک ایسا قوی معلم بھی ہے جو ہمارے دل و دماغ کو مسخر کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری روح میں ہلچل پیدا کر سکتا ہے۔ جو ہمیں نیند سے بیدار کر کے آغاز کار کے لیے متاثر کر سکتا ہے۔

دوسروں کے لیے جینا ایک عظیم وصف ہے اور یہ وصف شہد کی مکھی کی زندگی میں بدرجہ اولیٰ نمایاں ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی اپنی پوری زندگی ایک ایسی لذیذ ترین چیز کو بنانے کی مشقت میں مشغول رہتی ہے جسے وہ خود کبھی استعمال نہیں کرتی۔ شہد کی مکھی ایک ایسا مزدور ہے جو زندگی بھر ہم انسانوں کو ذائقے کی لذت فراہم کرنے کے لیے محنت و مشقت کرتا رہتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ مظہر زمانہِ قدیم سے لے کر آج تک دیکھا جا رہا ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ ہم اس سے یہ سبق حاصل کریں کہ:

- دوسروں کے لیے جینا بھی زندگی کا نصب العین ہو سکتا ہے۔
- دوسروں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنا بھی ایک ایسا ہدف ہے جس سے زیادہ سے زیادہ چہروں پر مسکراہٹ دکھائی دے گی۔
- لوگوں کے مسائل اور پریشانیوں کو سننا بھی جینے کا ایک مقصد ہو سکتا ہے۔
- اگر کچھ جانوروں کا انحصار ہم پر ہے تو پھر ان کا خیال رکھنے کی ذمہ داری بھی ہم پر فرض ہے۔
- پیڑ پودوں اور کاشت کا خیال رکھنا بھی ایک ایسی غیر تحریر شدہ ذمہ داری ہے جو ہمیں جاں فشانی کے ساتھ ادا کرنی چاہیے۔

تو پھر آیئے ہم سب دوسروں کے لیے جئیں! آیئے ہم سب شہد کی مکھی بنیں!

جاوید چوہدری

بچے نالائق ہی اچھے

سوریندرا کمار ویاس میری وش لسٹ، میں شامل ہے، میں چاہتا ہوں میں زندگی میں کبھی نہ کبھی بھوپال جاؤں، اس شخص سے ملوں، اس کے ساتھ تصویر بنواؤں اور یہ تصویر پاکستان کے ان تمام والدین کو بھجوا دوں جو اپنے بچوں کو ہمیشہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن پر دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر ان سے عرض کروں، دنیا میں سوریندرا کمار ویاس جیسے لوگ بھی موجود ہیں، بچوں کی ناکامی پر خوش اور مطمئن والدین۔

میں سوریندرا کمار ویاس سے کیوں ملنا چاہتا ہوں، آپ کو یہ جاننے کے لیے میری وش لسٹ، میں شامل اس حیران کن کردار کا کارنامہ ملاحظہ کرنا پڑے گا، سوریندرا کمار ویاس بھوپال شہر کی وارڈ شیواجی میں رہتے ہیں، یہ ٹھیکیدار ہیں، ان کا بیٹا آشو ویاس پڑھائی میں اچھا نہیں تھا، یہ کوشش کرتا تھا لیکن یہ زیادہ نمبر حاصل نہیں کر پاتا تھا، آشو ویاس کا مئی 2018 میں میٹرک کا نتیجہ نکلا اور یہ بورڈ کے امتحان میں بری طرح فیل ہو گیا، یہ اداس شکل بنا کر گھر آیا تو یہ حیران رہ گیا۔

آشو ویاس کے والد سوریندرا کمار ویاس نے بیٹے کی ناکامی کی خوشی میں گھر میں جشن کا اہتمام کر رکھا تھا، جشن میں خاندان کے لوگ بھی مدعو تھے، دوست احباب بھی، کاروباری رفیق بھی اور محلے کے لوگ بھی، سوریندرا کمار نے کھانوں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا، آتش بازی کا بھی اور موسیقی کا بھی، آشو ویاس جوں ہی گھر میں داخل ہوا، لوگوں نے بھرپور تالیوں سے اس کا استقبال کیا، اس کے گلے میں ہار ڈالے اور اس کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا، وہ لوگ جوں جوں ناچتے جاتے تھے چھت پر آتش بازی ہوتی جاتی تھی۔

آشو ویاس اس سلوک پر حیران ہو رہا تھا، اس کا خیال تھا یہ لوگ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں، یہ لوگ سمجھ رہے ہیں میں نے امتحان میں پوزیشن لے لی ہے، وہ والد کو بار بار روک کر بتانے کی

کوشش کرتا رہا لیکن والد اسے ساتھ لے کر ناچتا رہا یہاں تک کہ وہ دونوں ناچتے ناچتے تھک گئے، سوریندرا کمار نے تھکنے کے بعد اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا، ڈی جے کے پاس آیا، مائیک اٹھایا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا آشو یا س میرا بیٹا ہے، یہ پاس ہو یا فیل ہو یہ میرا بیٹا رہے گا۔

مجھے آج دن کے وقت پتہ چلا یہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا ہے، کیا فرق پڑتا ہے، یہ آج فیل ہوا ہے، یہ کل کو پاس ہو جائے گا اور یہ اگر کل بھی پاس نہ ہوا تو بھی کیا فرق پڑتا ہے، یہ پھر بھی میرا بیٹا رہے گا، زندگی اور کامیابی صرف میٹرک کے امتحان تک محدود نہیں، یہ بہت لمبی، یہ بہت وسیع ہے، اس میں بے شمار امتحان آئیں گے اور ضروری نہیں میرا بیٹا ان امتحانوں میں بھی فیل ہو جائے گا، میں نے آج کی یہ پارٹی مستقبل کے ان امتحانوں کے لیے رکھی ہے جن میں میرا بیٹا شریک بھی ہوگا اور کامیاب بھی، میں اپنے بیٹے کو بتانا چاہتا ہوں۔

تم اس معمولی ناکامی پر اداس یا مایوس نہ ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں اس قسم کا والد نہیں ہوں جو بچوں کی ناکامی پر اداس ہو جاتا ہے اور بچے ڈپریشن کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں، میں ایسے بچوں کو نہیں، میں ایسے والدین کو ناکام سمجھتا ہوں، یہ کیسے لوگ ہیں جو ایک آدھ امتحان کو زندگی سمجھ کر اولاد جیسی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں، میں اپنے بیٹے کی ناکامی پر بھی خوش ہوں لہٰذا میں بیٹے کی اس ناکامی پر آپ سب کو مٹھائی اور کھانا کھلانا چاہتا ہوں، وہ اس کے بعد بیٹے کی طرف مڑا، فضا میں ہاتھ لہرایا اور کہا آئی ایم پراؤڈ آف یو مائی سن، تم جیتو یا ہارو، مجھے تم سے پیار ہے، بیٹا آگے بڑھا، باپ کے سینے سے لگا اور آنسو پونچھ کر بولا، ابا مجھے آپ پر فخر ہے۔

آپ دنیا کے سب سے اچھے والد ہیں، میں نے کوشش کی لیکن میں اس کے باوجود فیل ہو گیا، میں مزید کوشش کروں گا، میں اگلی ٹرائی میں ضرور کامیاب ہوں گا اور میں اگر اس میں بھی ناکام رہا تو میں زندگی کے اصل امتحانوں میں کامیاب ہو کر آپ کا سر فخر سے بلند کروں گا، میں ثابت کروں گا کہ میں ایک شاندار والد کا شاندار بیٹا ہوں۔ باپ بیٹے کا یہ پیار دیکھ کر محفل میں

موجود ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ آگے بڑھ بڑھ کر باپ اور بیٹے سے گلے ملنے لگے۔ یہ بھوپال بلکہ ہندوستان کی تاریخ کا اس نوعیت کا پہلا جشن تھا اور میں ناکامی کے اس جشن پر سوریندرا کمار ویاس کو مبارک باد دینے بھوپال جانا چاہتا ہوں، میں اس عظیم باپ کے گلے لگ کر اسے وش کرنا چاہتا ہوں۔

ہم برصغیر کے والدین نمبروں کی ایک جعلی اور مصنوعی جنت میں رہ رہے ہیں، ہم نے اپنے بچوں کو نمبروں کی ایک ایسی ریٹ ریس (چوہوں کی دوڑ) پر لگا دیا ہے جس میں یہ بیچارے روز جیتے اور روز مرتے ہیں، یہ جس کے لیے اپنی جان ہلکان کر دیتے ہیں اور یہ جس کی وجہ سے بچپن ہی میں ڈپریشن، ٹینشن، اینگزائٹی اور حسد جیسی ہولناک بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں، آپ ہر امتحان کے نتائج کے بعد اخبارات میں جوان بچوں کی خودکشیوں کی خبریں پڑھتے ہوں گے، سوریندرا کمار ویاس کے اپنے صوبے مدھیہ پردیش میں ہر سال سیکڑوں بچے امتحان میں کم نمبر آنے پر خودکشی کر لیتے ہیں، پورے بھارت میں یہ تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔

پاکستان میں بھی یہ وبا اب شہروں سے دیہات اور دیہات سے دور دراز کے علاقوں تک پہنچ رہی ہے، 2018 میں چترال جیسے پرامن علاقے میں ایک درجن جوان بچوں نے کم نمبر آنے پر خودکشی کر لی، دو جوان بچیاں دریا میں کود گئیں، ایک خوبصورت جوان بچے نے خود کو گولی مار لی جب کہ باقی بچوں نے چوہے مار گولیاں کھا لیں اور زہر پی کر مر گئے، میں اس خوفناک ٹرینڈ میں والدین، اساتذہ اور طالب علم تینوں کو ذمے دار سمجھتا ہوں۔

ہم سب نے مل کر اپنے تعلیمی نظام کو پراڈکٹو کے بجائے چیٹنگ بنا دیا ہے، ہم اپنے بچوں کو ٹرینڈ کرتے ہیں تم رٹا لگاؤ، استاد کی منت کرو یا پھر نقل کرو لیکن تمہارے نمبر اچھے آنے چاہئیں چنانچہ ہمارے بچے نمبروں کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں، اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ہمارے بچے قدرتی کے بجائے مصنوعی ماحول میں گرو کرتے ہیں، یہ نمبروں اور فگرز کو زندگی سمجھ لیتے ہیں

اور یوں یہ سفر حیات میں کلرک بن کر رہ جاتے ہیں، میں نے کسی جگہ پڑھا تھا، زندگی میں جو لوگ فیل نہیں ہوتے وہ پوری زندگی کامیابی کے مزے کو انجوائے نہیں کرتے اور یہ بات غلط نہیں۔

آپ نے اگر زندگی میں اندھیرا نہیں دیکھا تو آپ کو پوری زندگی روشنی کی قدر نہیں ہوگی، آپ نے اگر زندگی میں غربت نہیں دیکھی تو آپ پوری زندگی امارت کا سکھ محسوس نہیں کر سکتے اور آپ اگر زندگی میں بدصورت اور کمزور نہیں رہے تو آپ طاقت اور خوبصورتی کے ذائقے سے کبھی متعارف نہیں ہو سکتے اور ہم والدین، اساتذہ اور رشتے دار اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اپنے بچوں سے یہ سارے ذائقے، یہ ساری خوشیاں چھین لیتے ہیں، ہم انھیں خودکشی پر مجبور کر دیتے ہیں یا پھر انھیں ایسی زندہ لاشیں بنا دیتے ہیں جن کی جیبوں میں فگرز اور نمبروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ہم والدین ایک اور مغالطے کا شکار بھی ہیں، ہم اچھے نمبروں کو کامیابی کی ضمانت بھی سمجھ لیتے ہیں اور سعادت مندی بھی جب کہ حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے، آپ نے خود زندگی میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو امتحان میں ٹاپ کرتے اور زندگی میں ناکام ہوتے دیکھا ہوگا، آپ نے لاکھوں کروڑوں لوگوں کو اسکولوں اور کالجوں سے فیل ہونے کے بعد زندگی میں کامیاب ہوتے بھی دیکھا ہوگا۔

یہ عالمی ریسرچ ہے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ نمبر حاصل کرنے والے صرف ایک فیصد لوگ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں جب کہ تعلیم میں کم تر کامیابی کے حامل زیادہ تر بچے عملی زندگی میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ امتحانات میں زیادہ نمبر حاصل کرنا ہرگز ہرگز کامیابی کی گارنٹی نہیں، آپ کے بچے اچھے نمبروں کے ساتھ بھی ناکام ہو سکتے ہیں اور فیل ہو کر بھی زندگی میں بہت ترقی کر سکتے ہیں، میں نے اسی طرح زندگی میں بے شمار نالائق بچوں کو اپنے والدین کی بے حد خدمت کرتے دیکھا اور کامیاب بچوں کو اپنے والدین کو بیماری کے عالم میں اکیلا چھوڑ کر کامیابی کے پیچھے بھاگتے بھی دیکھا۔

میں کراچی میں ایک صاحب کے گھر گیا، اس کا بیٹا عاشق کی طرح ان کی خدمت کر رہا تھا، میں نے بیٹے کی تعریف کی تو وہ صاحب ہنس پڑے، میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا، میرے پانچ بیٹے ہیں، چار لائق ہیں اور یہ ایک نالائق، آج سارے لائق ملک سے باہر بیٹھے ہیں جب کہ یہ نالائق دن رات میری خدمت کرتا ہے، میں اسے دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں کہتا ہوں بچے نالائق ہی اچھے۔

ہم والدین کو اپنا زاویہ نظر تبدیل کرنا ہوگا، ہمیں سوریندرا کمار ویاس کی طرح اپنے بچوں کو ناکامیوں کے ساتھ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع دینا ہوگا، عین ممکن ہے اسکول میں ناکام رہنے والا بچہ زندگی میں تمام کامیاب بچوں سے آگے نکل جائے اور ہمارا کوئی ایک نالائق بچہ ہماری خدمت میں تمام لائق بچوں کو پیچھے چھوڑ جائے، وہ ہمارا فخر بن جائے، ہم والدین اپنے بچوں سے صرف دو توقعات رکھتے ہیں، یہ اپنی جوانی میں ہم سے زیادہ ترقی کریں اور یہ ہمارے بڑھاپے میں ہمارا خیال رکھیں اور یہ میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ نمبر حاصل کرنے والے اکثر بچے ان توقعات کے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔

یہ زندگی میں زیادہ ترقی بھی نہیں کر پاتے اور یہ والدین کو بڑھاپے میں اکیلا بھی چھوڑ دیتے ہیں چنانچہ پھر والدین کو بچوں کے اچھے نمبروں اور فرسٹ کلاس ڈگریوں کا کیا فائدہ ہوا؟ کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں اور یہ وہ سراغ زندگی ہے جو سوریندرا کمار ویاس پا گیا جب کہ ہم اس سے کوسوں دور بیٹھ کر بچوں کے گریڈ اور نمبر گن رہے ہیں اور یہ وہ وجہ ہے جس کے لیے میں بھوپال جانا چاہتا ہوں، سوریندرا کمار ویاس سے ملنا چاہتا ہوں اور اسے یہ بتانا چاہتا ہوں بے شک بچے نالائق ہی اچھے ہوتے ہیں۔

[بشکریہ روزنامہ ایکسپریس]

ڈاکٹر عرفان شہزاد

میں نمازی کیسے بنا؟

نماز با جماعت کی عادت مجھے بچپن سے پڑ گئی تھی۔ اور اس کی وجہ ایک ایسے مہربان کی مہربانی تھی، جس کا چہرہ بھی مجھے یاد نہیں۔

ہوا یہ کہ مجھے گھر سے تلقین کی جاتی تھی کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھو، لیکن میری طبیعت کچھ زیادہ حساس واقع ہوئی تھی۔ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی مجھے ڈانٹ کر اگلی صف سے نکال دے، یا میرا بازو پکڑ کر زبردستی مجھے پچھلی صف میں لا کھڑا کرے گویا مسجد آ کر میں نے کوئی جرم کر ڈالا ہو۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ مجھے اپنے سے اگلی صف میں دیکھ کر کوئی بزرگ چلانا نہ شروع کر دیں کہ نابالغ بچے کو آگے کھڑا کرنے سے بالغوں کی نماز نہیں ہوتی۔ اب میری وجہ سے کسی کی نماز نہ ہو، یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ چنانچہ میں مسجد میں نماز پڑھنے نہ جاتا اور گھر میں ہی امی اور بہنوں کے ساتھ نماز پڑھتا۔ اس پر بھی مجھے باتیں سننی پڑتیں اور مجبور کیا جاتا کہ مسجد جاؤ۔ آخر ایک دن میں نے اللہ سے ایک کمٹمنٹ کی: میں نے دعا کی اے خدا، آج میں مسجد جاؤں گا، اور پہلی صف میں نماز پڑھوں گا۔ لیکن اگر کسی نے مجھے میری جگہ سے ہٹا دیا تو میں پھر کبھی مسجد نہیں جاؤں گا!

مجھے یاد ہے وہ عصر کی نماز تھی۔ میں وضو کر کے پیچھے بیٹھ گیا اور نمازیوں کے کھڑا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ صف باندھی گئی، میں ہمت کر کے اٹھا۔ مولوی صاحب نے تکبیرِ تحریمہ کہی، نمازیوں نے ہاتھ باندھ لیے۔ میں صف کے دائیں طرف، آخری نمازی کے ساتھ کھڑا ہو گیا، لیکن میں نے نماز شروع نہ کی۔ میں بار بار پیچھے مڑ کے دیکھتا رہا کہ اگر کسی اور نے بھی آنا ہے تو پہلے آ کر شامل ہو جائے اور مجھے نہ ہٹائے۔

پھر ایک شخص آیا۔ لمبی کالی داڑھی اور ٹخنوں سے اوپر پائنچے۔ وضو کے پانی کے قطرے اس کی

داڑھی اور بازوؤں سے گر رہے تھے۔ میں نے اسے دیکھ کر سوچا کہ شکر ہے کہ نماز شروع نہیں کی، ورنہ اس مولوی نے تو کھینچ کر پرے کرنا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے پرے ہٹ کر اس کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ لیکن اس نے وہ کیا جس کی میں کبھی توقع نہیں کر سکتا تھا، اور اس صوفی صاحب سے تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے بڑے پیار کے ساتھ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے میری ہی جگہ کھڑا کر دیا اور خود میرے دائیں طرف کھڑا ہو گیا!

خود کو نمازیوں کے درمیان کھڑا پا کر مجھے جو خوشی، اطمینان اور فخر محسوس ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ اس شخص کے اس ایک حسنِ سلوک نے مجھے پکا نمازی بنا دیا۔ میں آج تک اس کے اس حسنِ سلوک کو نہیں بھول پایا۔

اب میرے بچے مسجد جانا چاہتے ہیں، بتائیے، اس شخص کو کہاں تلاش کروں؟

شیطان کو شکست دینے کا طریقہ
غلطی کے اعتراف کی عادت ہے
شیطان سے شکست کھانے کا طریقہ
غلطی کی تاویل کرنے کی عادت ہے (ابو یحییٰ)

زندگی امتحان ہے اور یہ امتحان
اکثر ان لوگوں کی شکل میں لیا جاتا ہے
جن کے ساتھ ہمارا معاملہ پیش آتا ہے (ابو یحییٰ)

شفقت علی

چھوٹے چھوٹے کام

جُولیا اے کارنی (1908-1823) ایک امریکی ماہرِ تعلیم، مصنفہ اور شاعرہ گزری ہیں جن کی بچوں کے لیے ایک نظم "Little Things" بہت مشہور ہے۔ اگرچہ یہ نظم بچوں کے لیے لکھی گئی تھی مگر اپنے آفاقی پیغام کی وجہ سے یہ بڑوں کے لیے بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ نظم کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑی چیزوں کو جنم دیتی ہیں جیسے ریت کے ذرات جو عظیم صحرا بناتے ہیں اور پانی کے قطرے جو بڑے سمندر میں ڈھل جاتے ہیں۔۔۔ بالکل اسی طرح چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہماری روح کو نیکی کی راہ سے پرَے کر دیتی ہیں۔ تاہم مہربانی کے چھوٹے چھوٹے کام اور پیار بھرے جُملے اس دنیا کو جنت سا حسین بھی بنا سکتے ہیں۔''

خدمتِ خلق کے لیے دو قسم کے کام ہیں۔ پہلی قسم ان ''بڑے بڑے'' کاموں کی ہے جن کی تکمیل کے لیے بہت سا وقت اور وسائل کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً لوگوں کی فلاح و بہبود (Social Welfare) کا کام، اشاعتِ دین کا کام یا کسی ادارہ کا قیام وغیرہ۔ یہ بڑے کام انفرادی طور پر کرنا مشکل ہوتے ہیں لہٰذا عموماً ایک جماعت یا تنظیم کے زیرِ انتظام ہوتے ہیں۔

دوسری قسم ہے ان ''چھوٹے چھوٹے'' کاموں کی جنہیں کرنے کے لیے بہت سا وقت اور وسائل کی ضرورت نہیں پڑتی اور انہیں ہر کوئی با آسانی اور انفرادی طور پر کر سکتا ہے مثلاً سلام میں پہل کرنا، مسکرا کر ملنا، میٹھے بول بولنا، کسی کی بات کو غور سے سننا، ہر ایک کی عزت کرنا، خیر کی بات پہنچانا، کسی کو راستہ دینا، دوسروں کی مدد کرنا، دوسروں کو رعایت دینا، اپنی غلطی پر معذرت کرنا، لوگوں کا

شکریہ ادا کرنا، بہتر مشورہ دینا، حوصلہ افزائی کرنا وغیرہ۔

یہ ''چھوٹے چھوٹے کام'' اصل میں مواقع (opportunities) ہیں جو ہر روز ہمیں ملتے ہیں۔ ہر وہ انسان جو انسانیت کے فائدے کے لیے واقعی کچھ کرنا چاہتا ہے وہ اپنے ان چھوٹے چھوٹے کاموں سے لوگوں میں آسانی پھیلا سکتا ہے۔ وہ ممکن سے آغاز کرتے ہوئے معاشرے کا ایک فائدہ مند رُکن بن سکتا ہے۔ وہ خالق و مخلوق دونوں کو راضی کر سکتا ہے اور بقول شاعرہ ہماری اس دنیا کو جنت نما بنا سکتا ہے۔

لاریب ساعت

ختم ہو جائیں گے سب تکئے' بھروسے ایک دن
اِک فقط حسن عمل کا آسرا رہ جائے گا
اُس گھڑی کا خوف لازم ہے' کہ انور جس گھڑی
دھر لئے جائیں گے سب اور سب دھرا رہ جائے گا

(انور مسعود)

گناہ کی عارضی لذت کا کیا فائدہ
جس کی سزا کبھی ختم نہ ہو گی
صبر کی عارضی مشقت سے کیا ڈرنا
جس کی جزا کبھی ختم نہ ہو گی

(ابو یحییٰ)

ریاض علی خٹک

صنوبر اور حسد

صنوبر کے درخت بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ سدابہار ہوتے ہیں۔ دوسو سال تک ان کی عمر جاتی ہے۔ آپ کسی جوان صنوبر کے درخت کے ساتھ ستانے بیٹھ جائیں تو یہ تصور کر سکتے ہیں کہ آپ کے پردادا بھی کبھی اس کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ یہ بہت بلند قامت ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ دوسو فٹ بلندی تو عام ہے۔

لیکن اسی صنوبر کو ایک اتنا چھوٹا کیڑا جسے آپ عام آنکھ سے دیکھ بھی نہیں سکتے وہ لگ جائے تو یہ اس صنوبر کے درخت کو کیا اس کے پورے جنگل کو کھا جاتا ہے۔ یہ کیڑا جسے Pinewood nematode کہتے ہیں، تنے سے شروعات کرتا ہے اور پھر شاخوں پتوں سب کو اندر سے کھا جاتا ہے۔ یہ درخت میں جگہ جگہ پانی پہنچانے کی رگوں کو ہی کھا جاتا ہے۔ اس لیے ایک سرسبز درخت ڈرامائی انداز میں ہفتوں کے اندر سوکھ جاتا ہے۔

حسد بھی ایک ایسا ہی کیڑا ہے جو انسان کو کھاتا ہے۔ شروع میں ہم اسے سمجھ ہی نہیں پاتے۔ ہم اپنی کیفیات کے لیے جواز ڈھونڈتے ہیں۔ ہم بروقت اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرتے۔ یہ بتدریج ہم میں سما جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے ہم ہر ایک سے حسد شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اس کا ڈر بالکل نہیں ہے کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے البتہ میں اس بات کا اندیشہ کرتا ہوں کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے دنیا کے مزوں میں پڑ کر حسد نہ کرنے لگو۔'' (صحیح بخاری، جلد دوم، حدیث نمبر 1218)

صنوبر کے درختوں کے بچاؤ کے لیے اب تک تحقیقات چل رہی ہیں لیکن ہم اپنے حسد کے کیڑے کو مار سکتے ہیں۔ بس احساس کمتری چھوڑ دیں، حسد خود ہی مر جائے گا۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (62)

تصوف کا مثبت پہلو

ان تمام تضادات کے باوجود مسلم اہل تصوف نے چند ایسی خدمات سرانجام دی ہیں جن کی مثال دوسری قوموں کے صوفیوں میں نہیں ملتیں۔ ہندو اور عیسائی صوفیاء کے برعکس مسلم صوفیاء نے جنگلوں میں چھپ کر زندگی گزارنے کے بجائے معاشرے کے بیچ میں رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ابتدائی صدیوں میں فقہ اور حدیث کی تدوین اور کلامی و فلسفیانہ بحثوں میں مشغولیت کے باعث اہل علم کی بڑی تعداد عوام الناس کی اخلاقی تربیت نہ کر سکی تھی۔ صوفیاء نے اس خلا کو پر کیا۔ انہوں نے انسانی نفسیات میں گہری مہارت حاصل کی اور اس کو اپنے نظریات پھیلانے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی اخلاقی تربیت کے لیے استعمال کیا۔

مسلمانوں کے علماء میں بالعموم عوام سے دوری کا رجحان رہا ہے۔ انہوں نے عام طور پر دین کو دلوں میں اتارنے کے بجائے ڈنڈے کے زور پر اسے لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس مسلم صوفیاء نے عوام سے قربت اختیار کی۔ انہوں نے اپنے لباس، رہن سہن اور نشست و برخاست کو عوامی بنایا۔

علماء نے اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا طریقہ اختیار کیا۔ برصغیر کے علماء نے عام طور پر مقامی زبانوں کے بجائے عربی و فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس طریقے سے وہ پڑھے لکھے طبقے تک تو اپنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو گئے مگر عوام الناس تک ان کی رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس صوفیاء نے عوامی طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے عوامی ذوق کے مطابق مقامی زبانوں میں اپنا پیغام پیش کیا۔ ہمارے ہاں پنجابی، پشتو اور سندھی زبان کی شاعری کا بڑا حصہ صوفیانہ کلام پر مشتمل ہے۔

صوفی بزرگ آسان آسان نظموں کی صورت میں اپنا پیغام لکھ دیتے۔ اس پیغام کو لے کران کے مرید گویے، بھانڈ اور میراثی گرد ونواح کے دیہات میں پہنچ جاتے اور چوپالوں میں گا گا کر یہ پیغام لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دیہاتی معاشرت میں صوفی ازم کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ علماء کے برعکس صوفیاء میں رواداری کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ تشدد اور سختی کے ذریعے اپنی بات منوانے کے بجائے ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنی بات کو اعلیٰ ادبی شہ پاروں اور خوبصورت تمثیلات کی مدد سے منوایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے صوفی ازم کے احیاء کی بات کی جا رہی ہے۔

ان سب معاملات کے ساتھ ساتھ صوفی بزرگ طب اور بعض پیرا سائیکالوجیکل علوم جیسے ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی، تعویذ گنڈوں وغیرہ میں مہارت حاصل کرتے اور اسے عام لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کرتے۔ جس کا مسئلہ حل ہو جاتا، وہ ان بزرگ کا بے دام غلام بن جاتا اور جس کا مسئلہ حل نہ ہوتا، وہ اسے رضائے الٰہی پر صابر و شاکر رہنے کی تلقین کرتے۔ ان کی ان خدمات کے باعث انہیں معاشرے میں غیر معمولی مقام حاصل ہو گیا جو کہ اب تک باقی ہے۔

تزکیہ نفس اور انسان کی روحانی و اخلاقی تربیت کے لیے قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد تزکیہ نفس ہی کو قرار دیتے ہوئے اس کا طریقہ یہ بتایا کہ یہ رسول انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

> ''بے شک اللہ کا اہل ایمان پر عظیم احسان ہوا جب اس نے ان میں ایک شاندار رسول بھیجا جو کہ خود انہی میں سے ہے۔ وہ ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، انہیں (روحانی و اخلاقی آلائشوں سے) پاک کرتا ہے اور (اس کے لیے) انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس سے پہلے تو وہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر ہمارے اہل علم عوام کی سطح پر اتر کر انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے

اوران کی روحانی واخلاقی تربیت کرتے۔ان کے ایسا نہ کرنے کی وجہ سے وہ خلا پیدا ہوا جو اہل تصوف نے پر کیا اوراس پاکیزہ عمل میں بہت سی بدعات داخل کردیں۔

بُرسا اور مرمرہ ریجن

تصوف کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے قونیہ موڑ سے گزر کر ہم استنبول جانے والی موٹر وے پر پہنچ گئے۔ اب ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔تھوڑی دور جا کر جو پہلا ریسٹ ایریا نظر آیا، وہاں رک کر ہم نے کھانا کھایا۔

کارپوریٹ سوشل ریسپانسی بلٹی

یہاں کی موٹر وے پر خوبی یہ نظر آرہی تھی کہ مختلف سروس اسٹیشن مختلف کمپنیوں کو دے دیے گئے تھے۔کہیں شیل کا اسٹیشن نظر آرہا تھا اور کہیں ایگزان موبل کا، کہیں برٹش پٹرولیم کے اسٹیشن تھے اور کہیں ترکی کی کمپنی فاکس ٹوکے۔ یہ اچھا طریقہ تھا۔ ہماری موٹر وے پر ایک ہی کمپنی کو سارے سروس اسٹیشن دے دیے گئے ہیں جس کے نتیجے میں اجارہ داری قائم ہوگئی ہے۔ایک عام آدمی کو فائدہ اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے جب کاروبار میں اجارہ داری کو ختم کر کے مقابلے کو عام کیا جائے۔

قدیم اور جدید دور کے کاروبار میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قدیم دور میں کاروبار اوراس کے مالک کی شخصیت میں فرق نہ ہوا کرتا تھا۔اگر کاروبار میں نقصان ہوتا تو یہ مالک کی ذاتی ذمہ داری ہوا کرتی تھی کہ وہ اپنے گھر کے اثاثے بیچ کر قرض خواہوں کی رقم ادا کرے۔ جدید دور میں جائنٹ اسٹاک کمپنی کا تصور پیدا ہوا۔ اب کاروبار کو ایک علیحدہ شخصیت فرض کرلیا گیا۔ اب نقصان کی صورت میں قرض خواہوں کو بس وہی رقم مل سکتی ہے جو کمپنی کی ملکیت اثاثے بیچ کر پوری کی جاسکے۔اس تصور نے سرمایہ دارانہ نظام کو زبردست تقویت دی۔ وہ لوگ جن کا کمپنی کے معاملات پر مکمل کنٹرول ہو، باآسانی کمپنی کے اثاثے اپنے ذاتی نام سے رکھ سکتے ہیں تاکہ قرض خواہوں کو ادائیگی نہ کرنی پڑے۔

پروین سلطانہ حناؔ

غزل

ہوشمندی سے فیصلہ کیجیے
بات ہو حق کی بر ملا کیجیے
ہو جو در پیش مسئلہ کوئی
باہمی مشورہ کیا کیجیے
کوئی گتھّی سلجھ نہ پائے تو
گفتگو کا تبادلہ کیجیے
ایک وقتی غبار ہے غصّہ
درگزر آپ کر لیا کیجیے
کتنی ناپائیدار ہے دنیا
جستجو اس کی مت کیا کیجیے
الجھنیں ورنہ بڑھتی جائیں گی
بات کرنے کا حوصلہ کیجیے
جن کا شیوہ ستم شعاری ہے
ان کے حق میں بھی کچھ دعا کیجیے
دل کسی نے اگر دُکھایا ہو
معاف کرنے کا حوصلہ کیجیے
تلخ یادیں اگر ستائیں حناؔ
ان سے آنکھیں چُرا لیا کیجیے

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ماہنامہ
اِنذار

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوایئے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجئے......یا
ایک پے آرڈر/ بینک ڈرافٹ بنام "ماہنامہ انذار" بینک الفلاح المحدود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوایئے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے
ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے
ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

Monthly
INZAAR

MAR 2019
Vol. 07, No. 03
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi